سیّد انصر

ہونے کو تو اس شہر میں کیا کیا نہیں ہوتا

حیرت ہے کہ اک شخص ہمارا نہیں ہوتا
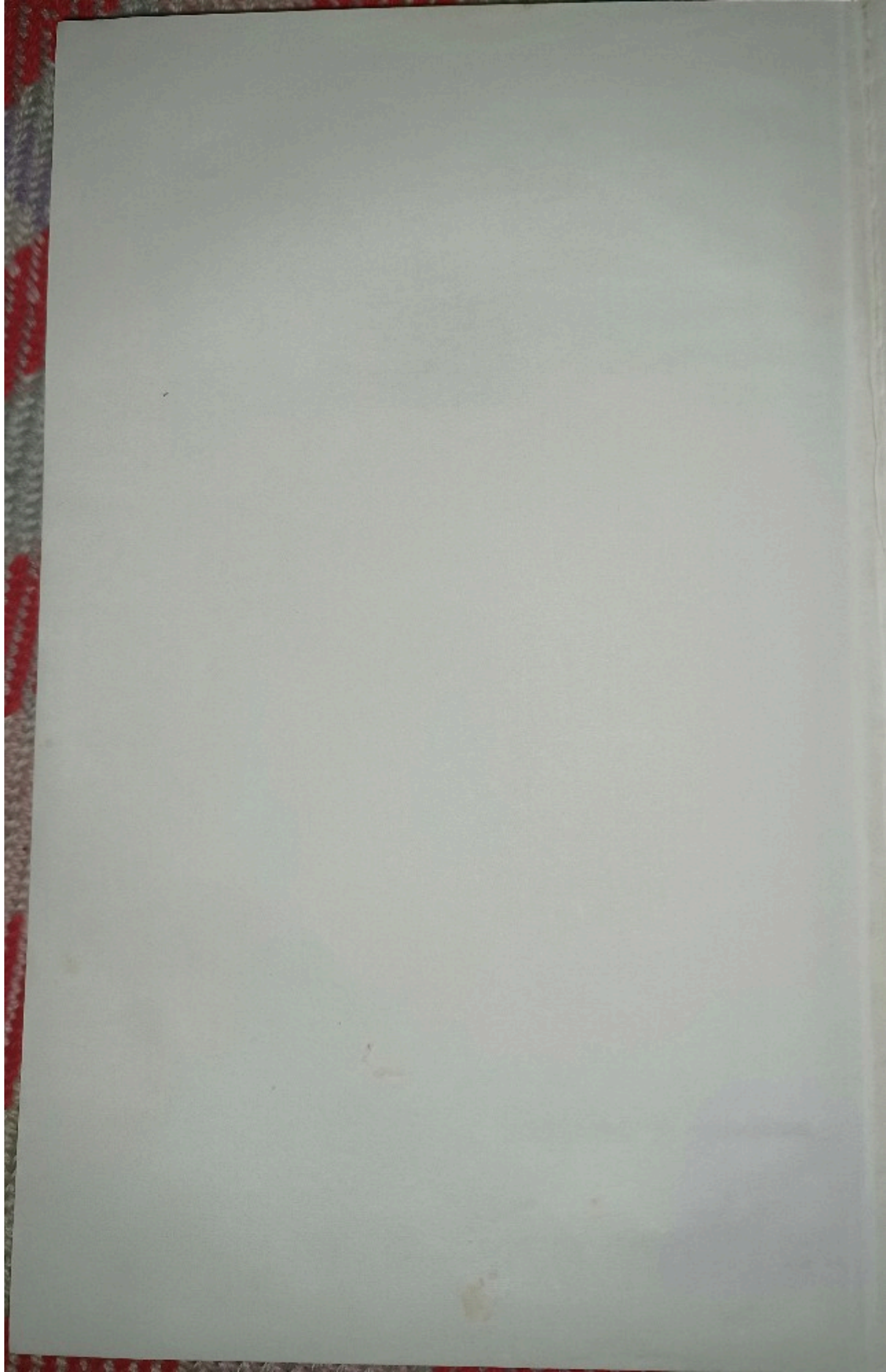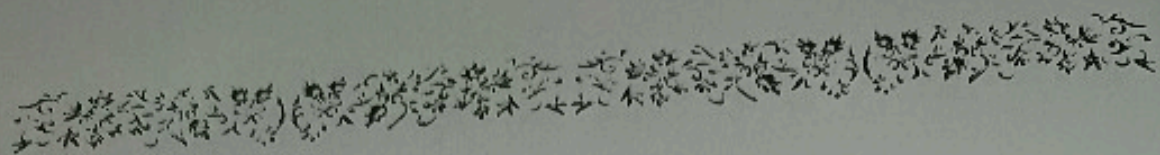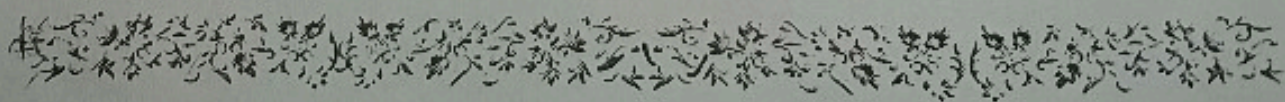
دسترس

سیّد انصر

خزینہ علم و ادب

الکریم مارکیٹ اردو بازار - لاہور ۷۳۱۳۱۶۹، ۷۲۱۱۳۶۸

دیدہ زیب اور
خوبصورت کتب کا
واحد مرکز

تزئین واہتمام
نذیر محمد، طاہر نذیر

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اشاعت ـــــ ستمبر ۲۰۰۶ء
ایڈیشن ـــــ سوئم
سرورق ـــــ عمران شناور
قیمت ـــــ 150 روپے
بیرون ملک: 10 ڈالر، 5 پاؤنڈ

انتساب

پیارے چچا جان

سید شوکت شاہ مرحوم

کے نام

جن کی شفقت نے مجھے اجالوں سے ہمکنار کیا

شاعر کا پتہ

سیّد انصر

انصر میڈیکوز، سادات مارکیٹ، سرائے عالمگیر

0544-651841, 653863
Mob. 0300-9515623

ترتیب

دسترس کی شاعری

شعروسخن کی طرف تخلیقی میلان رکھنے والے اکثر لوگ اکیلے اور مقامی یا مرکزی ادبی حلقوں سے دُور یا ناوابستہ رہ کر شاعری میں بہت سا وقت برباد کر دیتے ہیں۔ بے خبری اور نادانی میں خود سے ذرا سینئر مگر خودپسند قسم کے ناپختہ شاعروں کے مجہول شاعرانہ طرزِ عمل اور پرنخوت دعووٗں پر بھروسہ کر کے ان کی صحبت میں جکڑے جاتے ہیں اور ان کے زیرِ اثر ویسی ہی الا بلا شاعری ان کے حصے میں بھی آ جاتی ہے جو اس دائرے کے بیچ مروّج ہوتی ہے اور جس پر یہ حسن ظن قائم کر لیا جاتا ہے اور یہ غرورنفس بھی دماغ میں بٹھا لیا جاتا ہے کہ ہماری طرح کا کوئی دوسرا نہیں۔ اس کے برعکس بعض نوجوان شاعر جو ذہین و باشعور ہوتے ہیں اور جن میں شاعری اور تخلیق کاری کی خداداد استعداد کا جوہر خفی ہوتا ہے وہ جب شعرگوئی کے نئے لب ولہجہ اور ہم عصر تخلیق کے تقاضوں کی ہوا و فضا سے آشنا ہوتے ہیں تو پھر ان میں بتدریج یہ فکر و احساس بھی سر اٹھانے لگتا ہے کہ انہوں نے کس طلسم وخواب میں اپنی بیشتر شاعری کے ماہ وسال

ضائع کر دیئے ہیں۔ اسی کرب اور تلاش میں کسی موقع پر وہ ذہنی طور پر بتدریج یا کسی اندرونی روزِ نفس کے تحت اس فرسودہ شاعرانہ ماحول کی جکڑ بندی سے باہر نکلنے اور رفتہ رفتہ اپنی حسیات میں عصری ادب کی تحریک قبول کرتے ہوئے اپنی شاعری کو نئی تبدیلیوں کی رَو سے آشنا کرنے لگتے ہیں۔ سنجیدگی اور ذمہ داری سے نئے انداز میں اشعار کہنے لگتے ہیں اور بتدریج اپنے شعری اظہار پر اعتماد کا منصب پا لیتے ہیں۔

سید انفر بھی موخرالذکر شاعروں میں ایسا شاعر ہے کہ جن سے اس کی وارداتِ حال بھی مختلف نہیں۔ اس کی ذہانت، سلامت طبع، خداداد استعدادِ شعری، تخلیقی لگن اور اُپج اس کے کام آئی اور فرسودہ روایتی شاعری اور ایسے ہی ناقص شاعروں میں گھرا ہوا یہ شاعر بھی بالآخر ان جکڑ بندیوں سے باہر نکل آیا اور یوں اس پر بھی عصری شعر و ادب کے آفاق کھلے اور اسے اپنی شاعرانہ سطح اور مرکزی شعری معیارات کی پہچان ہوئی۔ ان معیارات کی روشنی میں یہ اپنی شاعری کا مسلسل جائزہ بھی لیتا رہا اور شعر کے نئے آفاق کی ذہنی شناخت میں بھی کم رہا۔ چنانچہ اس لیے بعد میں اسے پہلے کہی گئی بہت سی فرسودہ مضامین پر مشتمل روایتی غزلوں اور بعض غزلوں کے اشعار کو قلمزد کرنا پڑا اور نئی غزلیں، نئی شعری قدروں کو سامنے رکھ کر، نئے اسلوب بیان سے کہنا پڑیں۔ ہر چند کہ اس کی شاعری کو گذشتہ ادوار کی شعری روایات کے اثر سے یکسر خالی قرار نہیں دیا جا سکتا مگر ان نئی تبدیلیوں کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے، جس سے اس کا تخلیقی عمل اور فکری طرزِ احساس عمومی سطح سے ابھر کر موضوع و مواد

اور اسلوب کی تبدیلیوں کے ساتھ امکانی حد تک جدید خطوط پر استوار اور ارتقاء اور ترفع کی راہ سے آشنا ہوا۔ اس طرح مجہول مدعیان سخن کے سایوں تلے سایہ بنا تھا۔ وہ جہاں ٹھہرے وہیں ٹھہرے رہ گئے اور یہ ان کا گھیراؤ توڑ کر اس حقیقی اور نئی روش پر قدم بڑھاتے بڑھتا گیا۔ جو قریب قریب غزل گوئی کی جدید معاصر روایت کی طرف نکلتی تھی۔ سید انصر کی شاعری نے مختلف مضامین و موضوعات اور تخیلات و مشاہدات کو کامیابی کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔

عشق و محبت کے جذبوں کی صداقت اور آفاقیت پر یقین، ماضی کو توانا روایتوں کی حرمت کا پاس و لحاظ، مستقبل کے امکانات اور اس کی تابناکیوں پر پورا اعتماد، خاکِ وطن سے محبت اور اس کے ناموس و وقار کا گہرا احساس انسان اور انسانیت کی قدروں سے دوستداری اور ان کا احترام، غلط رسوم و روایات کے بارے میں مخالفت و مزاحمت کا چلن، جھوٹی پارسائی کے دعووں اور جعلی و نمائشی لبادہ پوشی سے نفرت...... غرض اس کی شاعری معیشت و معاشرت اور تہذیب و اخلاق کے بیشتر پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس طرح اس کے ہاں یہ فکری رویے بھی سامنے آتے ہیں کہ وہ دوسروں کے وسیلوں پر انحصار نہیں چاہتا۔ غیروں کی منت کشی، متابعت اور ان سے احتیاج روائی کے خلاف خود انحصاری اور عزتِ نفس کے پندار پر یقین رکھتا ہے۔

قومی و تہذیبی سطح پر ہمہ پہلو رائیگانی اور زیاں کاری کا بھرپور احساس و شعور ملتا ہے۔ مگر ان حالات میں بھی وہ امید و رجائیت کی ایک

نئی جوت جگا لیتا ہے۔ حریفوں کی دشمنیوں اور مخالفتوں کو اپنے ''ہونے''
اور بھرپور توانائی سے ''زندہ ہونے'' کا ایک ناگزیر سبب جانتا ہے۔
معاشرتی یا مجلسی تعلقات کے معاملے میں عام لوگ ہوں یا دوست دو یہ
ایک کوان کی اپنی شخصی سطح اور مقام پر رکھنے کا قائل ہے۔

انصر کے کلام میں جہاں انسانیت وصداقت کے بارے میں
سوچیں بھی ہیں فکری انقلاب کی تحریک بھی اور معاشرے اور سیاسی نظام
کی منفی اقدار پر ضربیں بھی۔ وہاں حسن وعشق اور محبت ورومانیت کے
معاملات بھی اور جذبات وکیفیات کی خوشبوئیں بھی رچی ہیں۔ خواب و
خواہش سے کوئی انسان مبرا نہیں۔ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے دم سے
ہی نت نئے امکانات کی راہیں کھلتی ہیں۔ چنانچہ سید انصر نے بھی خواب
دیکھے ہیں اور خواہشوں اور امیدوں کی ایک دنیا آباد کی ہے۔

عملاً اس کا بھی محبت کے حادثات وواردات کے تجربوں سے آشنا
ہونا تو بعید از امکان نہیں مگر اس کے کلام میں اس کی محبت کے نظم وطریق
میں جس حقیقت پسندی، شائستگی اور پاکیزگی کا واضح احساس ملتا ہے وہ
خود اس کے شخصی ظاہر وباطن کی صفا اور صداقت وشرافت کا پرتو بھی ہے
اور مظہر بھی۔ اس کے نزدیک ہرجائی پن ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔ محبت
نہیں ہوس ہے۔ محبتوں، دوستیوں اور سماجی تعلقات سے انصر ''بہت
کچھ'' نہیں چاہتا۔ قناعت پسندی کو اپنا شعار بناتا ہے اور محبوب کی چشم
التفات ہو یا کسی اور طرف سے، وہ تھوڑی سی عنایت بھی بڑی بات سمجھتا
ہے بلکہ جیسا کہ خود اس نے کہا ہے کہ پیڑ میں سوکھی ہوئی ڈالی بھی اسے

ہری لگتی ہے تو وہ غنیمت جانتا ہے۔

وہ اپنے اشعار میں مبتذل منفی اور بے معنی سوچوں کو راہ نہیں دیتا اور اپنے سچے اور کھرے مزاج کی طرح اپنے افکار کو کچھ اس انداز کی بھرپور معنویت سے آشنا کرتا ہے کہ اس کا پیغام اس کی شعری صداقت کا مظہر بن جاتا ہے۔ بزرگ شعراء میں سے کسی کا شاید اس طرح کا قول ہے کہ اگر کوئی شاعر ایک بھی اچھا شعر کہہ لیتا ہے تو وہ بے شک ایک اچھا شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔ سید انصر کے کلام پر سرسری نظر سے میں نے بیسیوں ایسے اشعار کا انتخاب کیا ہے کہ ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ انصر محض اچھا شاعر نہیں بلکہ بہت اچھا اور ایسا جینوئن شاعر ہے جس میں امکانات کا ایک عالم مضمر ہے۔ لمحۂ موجود میں جب اس کے کلام غزل کا اعتبار ایسا ہی محکم ہے تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تخلیقی سرگرمی کے تسلسل میں اس کے امکانات بھرے امروز کا فردا کتنا تابناک ہو گا اور میرے اندازے میں وہ وقت دور نہیں۔

نہ سہی خوئے کرم دورِ ستم پرور میں
یہ کرم کم ہے کہ امید کرم زندہ ہے

......

وحشتِ دربدری کل بھی یہی تھی انصر
پر یہ عالم تو نہ تھا بے سروسامانی کا

......

عشق میں آخری منزل کا تعین مشکل
آپ دیوار کے پیچھے ہیں نہ ہم دار کے پار

تیرے قدموں میں جو رکھا ہے وہ سر کس کا ہے
کس کی دستار پڑی ہے تری تلوار کے پار

......

ہم تو سمجھے تھے کہ تم بھی ہو پرستاروں میں
کیا خبر تھی کہ تمہی دستِ ہنر کاٹو گے

......

میں تو سورج سے الجھنے کے لیے نکلا تھا
کون لایا ہے تہِ سایۂ دیوار مجھے

اقبال کوثر

حمد

لوحِ دل پر جو تیری ثنا لکھ رہا ہوں
طائرِ جاں کی ہے یہ غذا لکھ رہا ہوں

تیرا ہی ذکر کرتی ہوئی چل رہی ہے
صبح کی مہکی ہوا لکھ رہا ہوں

پیڑ، پتھر، پرندے، گھٹا، چاندنی سب
کر رہے ہیں اسی کی ثنا لکھ رہا ہوں

دیکھ پاتا نہیں ہوں کہیں بھی تجھے میں
تجھ کو موجود بھی جابجا لکھ رہا ہوں

تیری حکمت ورائے حدِ عقل و دانش
سو تجھے بے حد و انتہا لکھ رہا ہوں

تاج و اورنگ کیا کشور و سلطنت کیا
چاہیے بس ترا آسرا لکھ رہا ہوں

جب تلک دل کی دھڑکن نہ تھم جائے انصرؔ
حمد کہتا رہوں یہ دعا لکھ رہا ہوں

نعت

بخت بگڑا ہوا اک آن میں اچھا بن جائے
نعت کہتا ہوں کہ بخشش کا وسیلہ بن جائے

وہ تو وہ ان کے غلاموں کا ہی رتبہ دیکھو
یہ جہاں پاؤں دھریں دشت بھی دریا بن جائے

بارہا جس نے چھوئے ہوں شہِ طیبہ کے قدم
کاش وہ خاک مری آنکھ کا سرمہ بن جائے

کیوں نہ سو ناز کروں پھیلے ہوئے دامن پر
اس کو کیا چاہیے جو آپ کا منگتا بن جائے

کون اس شخص کو محتاج بنا سکتا ہے
آپؐ کا دستِ کرم جس کا سہارا بن جائے

امامِ کربلا کی نذر

فرازِ تخت پہ جب سے بکھر گیا ہے یزید
نگاہِ دہر میں اس دن سے مر گیا ہے یزید

حسینؑ آئیں! سرِ رزم گاہِ کرب و بلا
کہ اب تو ظلم کی حد سے گزر گیا ہے یزید

مرا ضمیر یہ کہتا ہے تیرا سر لے کر
خود اپنا سر ترے قدموں میں دھر گیا ہے یزید

رہِ حسینؑ رہِ نور ہے یقیں جانو
اُدھر نہ جاؤ خدارا جدھر گیا ہے یزید

یہی ہے معجزۂ حق کہ سر کٹا کر بھی
حسینؑ زندہ رہے اور مر گیا ہے یزید

گماں سزا کا ہے جس پر کہیں جزا ہی نہ ہو
سمجھ رہے ہو جسے زہر وہ دوا ہی نہ ہو

تجھے گنوا کے یہ احساس ہو رہا ہے مجھے
کہ دوستی میں محبت کی بے پناہی نہ ہو

سزا سنائے گا کیوں کر مجھے مرا منصف
مرے خلاف اگر کوئی بھی گواہی نہ ہو

مرے حریف خدا سے یہی دعا ہے مری
کہ تیرے سر کبھی الزامِ روسیاہی نہ ہو

کہاں صبا کہاں برگِ خزاں پہ تُو ہم سے
ملے تو ایسے ملے عمر بھر جدا ہی نہ ہو

وہ زخم زخم نہیں جس میں تو دکھائی نہ دے
وہ درد درد نہیں جو تری عطا ہی نہ ہو

مرے غنیم بھلا کس طرح یہ ممکن ہے
تمام شہر ہی لٹ جائے اور تباہی نہ ہو

مجھے سکوت کے آداب بخشنے والے
مرا کلام تری روح کی صدا ہی نہ ہو

ملو ہر ایک سے انصرؔ مگر خیال رہے
نظر وہاں نہ ملے دل جہاں ملا ہی نہ ہو

اس طرح روحِ بشر دستِ قضا لے جائے
جس طرح شمع کی لو موجِ ہوا لے جائے

ریگِ ساحل پہ پڑے خس کی طرح ہے یہ بدن
جانے کب موج کوئی آئے بہا لے جائے

کون حقدارِ گہر ہائے عقیدت ٹھہرے
کون یہ گنجِ گراں مایہ اٹھا لے جائے

بت پرستی کے ستائے ہوئے انسانوں کو
کیا عجب سوئے حرم یادِ خدا لے جائے

خشتِ دیوار نہیں ہوں کہ جگہ سے نہ ہلوں
میں تو خوشبو ہوں جدھر چاہے ہوا لے جائے

ہے اِدھر نارِ جہنم تو اُدھر باغِ بہشت
جانے کس سمت زمانے کی ہوا لے جائے

اپنی مرضی سے کہیں بھی نہیں جاتے انصؔر
ہم تو جاتے ہیں جدھر دل کی صدا لے جائے

بچا کے برق سے خاشاکِ آشیاں رکھو
رہو زمیں پہ نظر سُوئے آسماں رکھو

کڑا ہے ہجر کی برفاب وادیوں کا سفر
سروں پہ اوڑھ کے سورج کا سائباں رکھو

بدن سلگنے لگا ہے تو ہاتھ ملتے ہو
کہا تھا کس نے شراروں سے یاریاں رکھو

اٹھا کے سر پہ نہ رکھو ہر ایک شخص کو تم
مقام جس کا جہاں ہے اسے وہاں رکھو

عالمِ بے ثبات میں ہستیٔ بے اماں ہیں ہم
گاہ سرِ صلیب ہیں گاہ سرِ سناں ہیں ہم

کشمکشِ حیاتِ دہر اتنا فراغ دے ہمیں
خود سے ملیں تو پوچھ لیں کون ہیں ہم کہاں ہیں ہم

تم سے جہاں جہاں ملے خود سے وہاں وہاں ملے
جانے کہاں کہاں ہو تم جانے کہاں کہاں ہیں ہم

تابِ خیالِ یار سے ہمسرِ آفتاب ہیں
ورنہ بساطِ خاک پر ذرّۂ بے نشاں ہیں ہم

زیست کیا مرگ ہے کیا شادی و ماتم کیا ہے
میرے معبود بتا مصرفِ آدم کیا ہے

معتبر اس نے کیا ضبط کا فن دے کے مجھے
ورنہ میں کیا ہوں مرا دیدۂ بے نم کیا ہے

تیری گلیوں کی بیابانی جسے راس آئے
اس کی نظروں میں بھلا رونقِ عالم کیا ہے

آنکھ روئی نہ ہنسے زخم بڑی مدت سے
دل کی دہلیز پہ ٹھہرا ہوا موسم کیا ہے

مانا مشکل ہے بہت راہِ محبت انصرؔ
وہ مرے ساتھ اگر ہے تو مجھے غم کیا ہے

ترا خیال تری بات ساتھ چلتی ہے
یہ کائنات مرے ساتھ ساتھ چلتی ہے

تمام عمر کا ملنا کوئی بھلا بھی دے
مگر وہ پہلی ملاقات ساتھ چلتی ہے

بچھڑنے لگتا ہے جب آخری مسافر بھی
تو ایک موجِ خیالات ساتھ چلتی ہے

یہ کیسی راہ پہ ڈالا ہے وقت نے مجھ کو
نہ کوئی دن نہ کوئی رات ساتھ چلتی ہے

بہت عزیز ہے آنکھوں کو آنسوؤں کی جھڑی
کوئی بھی رُت ہو یہ برسات ساتھ چلتی ہے

لہو کے قطرے قطرے میں رواں ہے نم اداسی کا
یہ کس نے میری نس نس میں بھرا ہے سم اداسی کا

ہوا کے سرد جھونکے جب کسی کی یاد لے آئے
مری صحرا سی آنکھوں میں در آیا یم اداسی کا

ہمیں اس شہر کی ویران گلیوں میں ٹھہرنے دو
بڑی مدت ہوئی دیکھے ہوئے موسم اداسی کا

نجانے قہقہوں کی رسم کتنی دیر باقی ہے
کوئی نکلا تو ہے تھامے ہوئے پرچم اداسی کا

پریشاں لوگ، ویراں شہر، حیراں چاند، سہمی رات
پڑا ہو کاکلِ ہستی میں جیسے خم اداسی کا

مآلِ رنگ و بو نزدیک ہی جانو کہ انصرؔ ہم
رگِ گل میں اترتا دیکھتے ہیں سم اداسی کا

ہر آدمی نے چہرے پہ چہرہ پہن لیا
یا پھر مری نگاہ نے دھوکا پہن لیا

اُترا دلِ زبوں میں ترے حسن کا خیال
جوں بحرِ بے کنار نے کوزہ پہن لیا

بدلے میں اک خوشی کے ہمیں کتنے غم ملے
اک پیرہن اتار کے کیا کیا پہن لیا

خائف تھا روشنی کی نگاہوں سے کس قدر
سورج کِھلا تو جسم نے سایہ پہن لیا

میں جب بھی گنگنانے لگا نغمۂ طرب
آہنگِ غم نے سازِ تمنا پہن لیا

لو پھر لبوں پہ آ کے ٹھہرنے لگے سراب
لو پھر ہماری آنکھ نے دریا پہن لیا

سفر بڑھا کے چبھن آبلوں میں چھوڑ گیا
جدا ہوا تو کڑی الجھنوں میں چھوڑ گیا

گزر گیا کوئی آئینہ خانۂ دل سے
نگہ کا عکس مگر آئنوں میں چھوڑ گیا

جزا کی طرح سما کر مری نگاہوں میں
سزا کا رنگ مرے آنسوؤں میں چھوڑ گیا

وہ کون تھا جو ہماری سلگتی سانسوں کو
بنا کے برف پگھلتی رتوں میں چھوڑ گیا

وہ جاتے جاتے دعاؤں کے چاک پر رکھ کر
مرا نصیب نئی گردشوں میں چھوڑ گیا

عجیب شخص تھا اک عمر پاس رہ کر بھی
رسائیوں کی طلب بازوؤں میں چھوڑ گیا

کوئی آواز اُترتی نہیں دیوار کے پار
حسرتیں سو ہی نہ جائیں لبِ اظہار کے پار

اتنے چہرے مری آنکھوں میں ابھر آئے تھے
جتنے تیر آ کے گرے تھے مری دستار کے پار

عشق میں آخری منزل کا تعین مشکل
آپ دیوار کے پیچھے ہیں نہ ہم دار کے پار

تیرے قدموں میں جو رکھا ہے وہ سر کس کا ہے
کس کی دستار پڑی ہے تری تلوار کے پار

کیوں طبیعت کو خوش آتی نہیں گھر کی رونق
کیوں کھنچی جاتی ہیں آنکھیں در و دیوار کے پار

رات کے پچھلے پہر گھر سے چلے ہو انؔقر
اور پھر جانا بھی ہے کوچۂ اغیار کے پار

گلہ زیاں میں گیا ہے نہ سر خسارے میں
تمہیں خبر نہیں شاید ہمارے بارے میں

وہ جس کے قُرب کا امکاں نہیں اسی کا نام
سجا لیا ہے تمنا کے استعارے میں

بنائے شہر میں رکھ تو دیا ہے کاسۂ سر
جو حکم ہو تو ملا دوں لہو بھی گارے میں

نہاں ہیں کتنے ہی یادوں کے زخم دل کے بیچ
رواں ہیں کتنے ہی نشتر لہو کے دھارے میں

گیا وہ وقت کہ دکھ سکھ کی سانجھ تھی انصرؔ
گیا وہ دور کہ مل بیٹھتے تھے دارے میں

خوشی سے غم کے آنسو پی رہے ہیں
بڑی آسودگی سے جی رہے ہیں

کٹے ہیں جو تمہاری آرزو میں
وہ دن ہم پر بہت بھاری رہے ہیں

کوئی پوچھے تو کہہ دیتے ہیں ہنس کر
خدا کا شکر ہے بس جی رہے ہیں

کبھی شہرِ خموشاں کے مکیں بھی
ہمارے شہر کے باسی رہے ہیں

جہاں ویرانیاں رہتی ہیں انؔصر
اسی گھر میں کبھی ہم بھی رہے ہیں

چل گیا وار تیری آنکھوں کا
ہو بھلا یار تیری آنکھوں کا

ہم زمانے سے بے خبر ٹھہرے
کر کے دیدار تیری آنکھوں کا

تیری صورت اگرچہ یاد نہیں
یاد ہے پیار تیری آنکھوں کا

کچھ نہ کہہ کر بھی کہہ دیا کیا کیا
ہائے اظہار تیری آنکھوں کا

ایک دن ہو ہی جائے گا انصرؔ
بخت بیدار تیری آنکھوں کا

گلستانوں میں ملیں گے نہ خیابانوں میں
ہم ہیں وہ پھول جو کھلتے ہیں بیابانوں میں

اب تغافل کا یہ عالم ہے کہ وہ طرفہ ادا
مجھ کو اپنوں میں سمجھتا ہے نہ بیگانوں میں

موجِ خوشبو سا اب آتا ہے گزر جاتا ہے
وہ جو رہتا تھا خیالوں کے پری خانوں میں

میرے کردار پہ الزام لگانے والو
تم نے جھانکا ہے کبھی اپنے گریبانوں میں

شاد رہنے کی تمنا تو بہت ہے لیکن
کیا رہے شاد کوئی رہ کے پریشانوں میں

قریۂ خواب سجانے والا
سو گیا مجھ کو جگانے والا

ہم جو روٹھیں بھی تو کس سے روٹھیں
کون آئے گا منانے والا

آج بھی دل کو یہ امید سی ہے
لوٹ ہی آئے گا جانے والا

جانے کیا سوچ کے اپنایا ہے
تو نے انداز زمانے والا

لے گیا نیند مری راتوں کی
میری آنکھوں میں سمانے والا

وہی دلچسپ حقیقت اپنی
وہی انداز فسانے والا

کیوں سرِ راہ کھڑے ہو انصرؔ
اب یہاں کون ہے آنے والا

شوق دکھلاتا ہے جب صبح کے آثار مجھے
اجنبی لگتے ہیں گھر کے در و دیوار مجھے

بس یہی مسئلہ ہے باعثِ آزار مجھے
چھوڑے جاتے ہیں کہاں آج مرے یار مجھے

جب کسی سائے کی ٹھنڈک نے دیا پیار مجھے
یاد آنے لگے گھر کے در و دیوار مجھے

میں تو سورج سے الجھنے کے لیے نکلا تھا
کون لایا ہے تہِ سایۂ دیوار مجھے

سجدۂ شوق غنیمت تھا تو کیوں میرا شعور
پھیر لایا تری دہلیز سے ہر بار مجھے

اب نہ اس دھج سے کوئی آئے گا مقتل کی طرف
حشر تک دیں گے صدائیں رسن و دار مجھے

وہ بہ اندازِ زلیخا کبھی آئے تو سہی
گھر کی دہلیز بھی ہے مصر کا بازار مجھے

مجھ کو دعویٰ نہیں امید ہے انشاء اللہ
زندہ رکھیں گے جہاں میں مرے اشعار مجھے

میں تو سویا ہوا گزرا تھا رہِ ہستی سے
دیکھنے والے سمجھتے رہے بیدار مجھے

وہ تھا ہمراہ تو دیوار بھی در تھی انؔصر
وہ جو ہمراہ نہیں در بھی ہے دیوار مجھے

کچھ بولو ناں

کس بات پہ تم شرمندہ ہو
ان وعدوں پر جو بھول گئے
ان قسموں پر جو ٹوٹ گئیں
ان جذبوں پر جو ماند ہوئے
اس رت کے بدلنے پر جس کے
رنگوں میں ڈوب کے خود تم نے
اپنا بھی رنگ بدل ڈالا
جینے کا ڈھنگ بدل ڈالا
اور بدلے ڈھنگ پہ زندہ ہو
کچھ بولو ناں
کس بات پہ تم شرمندہ ہو

آنکھ روشن ہے ابھی نقشِ قدم زندہ ہے
جانے والے تری یادیں ترا غم زندہ ہے

تیری قدرت سے میں زندہ ہوں مگر یاد رہے
میرے سجدوں کے سبب تیرا حرم زندہ ہے

نہ سہی خوئے کرم دورِ ستم پرور میں!
یہ کرم کم ہے کہ امیدِ کرم زندہ ہے

رنج و غم اس کی عطا ہے تو سنبھالو انؔصر
دل سلامت ہے ابھی دیدۂ نم زندہ ہے

اگلی گلی کے موڑ پہ رہتا تھا ایک شخص
میری محبتوں سے شناسا تھا ایک شخص

آنکھوں کو اس کے بعد سجھائی نہیں دیا
آئینے بانٹتا ہوا گزرا تھا ایک شخص

کل پھر نظر بچا کے گزرنا پڑا ہمیں
کل پھر ہماری راہ میں بیٹھا تھا ایک شخص

اک رنج و غم کی بھیڑ مقابل کھڑی تھی اور
ہنگامۂ حیات میں تنہا تھا ایک شخص

مجھ کو بھی دشمنوں کی ضرورت تھی شہر میں
مجھ کو بھی اپنی جان سے پیارا تھا ایک شخص

ترکِ تعلقات پہ نادم نہ تھا مگر
رخصت ہوا تو ٹوٹ کے رویا تھا ایک شخص

انصؔر وہ خواب تھا کہ حقیقت خبر نہیں
بس اتنا یاد ہے کہیں دیکھا تھا ایک شخص

اک روز تمنا کے سرابوں سے نکل جائے
وہ مجھ سے بچھڑ جائے عذابوں سے نکل جائے

امید کے گہنائے ہوئے چاند سے کہہ دو
آنکھوں سے جو اترا ہے تو خوابوں سے نکل جائے

تا دیر رفاقت میں بھی رسوائی کا ڈر ہے
خوشبو سے یہ کہہ دو کہ گلابوں سے نکل جائے

کیا جانیے کٹ جائے کہاں دستِ عناں گیر
کیا جانیے کب پاؤں رکابوں سے نکل جائے

وہ عشق ہی کیا ہے جو زمانے پہ عیاں ہو
وہ حسن ہی کیا ہے جو حجابوں سے نکل جائے

میری فریاد رائیگاں ٹھہرے
آہ نکلے تو داستاں ٹھہرے

یہ کڑی دھوپ اور تیز ہوا
کوئی چارہ کہ سائباں ٹھہرے

کون چاہے کسی کو عشق ہی جب
ناز برداریٔ بتاں ٹھہرے

ہم تو اس گلشنِ محبت میں
شاخِ نازک پہ آشیاں ٹھہرے

اے شامِ سفر مشکل ہے ڈگر تنہا ہوں میں
لرزاں ہیں قدم بہکی ہے نظر تنہا ہوں میں

کس حال میں ہوں کس رنگ میں ہوں کیا بتلاؤں
تنہا بھی نہیں دنیا میں مگر تنہا ہوں میں

مجھ ایسے ہزاروں اہلِ وفا ہوں گے لیکن
اس شہرِ وفا میں خاک بسر تنہا ہوں میں

ٹتا نہیں غم گھٹ جائے نہ دم تاروں کی قسم
اے چاند ذرا کچھ دیر ٹھہر تنہا ہوں میں

ویراں ہے نگر حیراں ہے نظر اے جان و جگر
اک بار اِدھر سے بھی ہو گزر تنہا ہوں میں

زیست جلتی ہے دہکتے ہوئے انگاروں میں
موت رقصاں ہے مرے شہر کے بازاروں میں

پھر کسی لشکرِ ابراہہ کی موت آئی ہے
سنگ اٹھائے ہیں ابابیلوں نے منقاروں میں

پیدا ہوتا ہے اسی قوم میں موسیٰ کا وجود
خوئے فرعون ہو جس قوم کے سرداروں میں

ہم اسیرانِ بلا جب بھی رواں ہوتے ہیں
در بناتے ہی چلے جاتے ہیں دیواروں میں

ظلم سے عدل کی امید نہ رکھو انصر
پھول کھلتے نہیں بارود کے انباروں میں

خیال وخواب کے دیوار و در بنائے ہوئے
ہوا کے دوش پہ بیٹھا ہوں گھر بنائے ہوئے

نجانے کون سے رستے پہ چل پڑا ہوں میں
کسی کی یاد کو زادِ سفر بنائے ہوئے

رواں دواں ہیں سرِ جادۂ وفا ہم لوگ
چراغِ دل لیے، شب کو سحر بنائے ہوئے

یہ کم نہیں ہے کہ اہلِ خرد کی بستی میں
مرا جنوں ہے مجھے معتبر بنائے ہوئے

لڑوں گا پیار کی یہ جنگ آخری دم تک
جنوں کو تیغ، وفا کو سپر بنائے ہوئے

دو شعر

ہر گام عداوت کا احساس دلاتا ہے
یہ کون مری رہ میں آئینے سجاتا ہے
جس روز سے بیٹھا ہوں انصاف کی مسند پر
جو شخص بھی ملتا ہے مجرم نظر آتا ہے

......

دو شعر

ہر غنچے میں تیری صورت ہر گل میں تیری خوشبو ہے
ہر لہجے میں تیرا لہجہ ہر منظر میں تُو ہی تُو ہے
کیوں کر چاہیں اور کسی کو ہم کیسے کوئی خواب بنیں
دل پر مہر تری چاہت کی آنکھوں میں ترے غم کا لہو ہے

ہونے کو تو اس شہر میں کیا کیا نہیں ہوتا
حیرت ہے کہ اک شخص ہمارا نہیں ہوتا

دل صورتِ دریا ہے تو دریا کے کنارے
وہ بھی چلا آتا ہے جو پیاسا نہیں ہوتا

ہر شکل شریفانہ تو ہو سکتی ہے لیکن
ہر شخص حقیقت میں فرشتہ نہیں ہوتا

ہر ایک سے ہنس ہنس کے مخاطب نہ ہوا کر
ہر ایک سے کھل جانا بھی اچھا نہیں ہوتا

جذباتِ محبت میں یہ ٹھہراؤ ہے کیسا
دریا تو مری جاں کبھی ٹھہرا نہیں ہوتا

تجدیدِ ملاقات بجا ہے مگر اب کے
دھڑکن پہ تری چاپ کا دھوکا نہیں ہوتا

اب جی میں جو آئے ہمیں کہہ لو مگر انصرؔ
اچھوں کو برا کہنا بھی اچھا نہیں ہوتا

سی لیے ہونٹ جو پندار بچانے کے لیے
رو پڑی آنکھ زمانے کو ہنسانے کے لیے

میں نے اس شہر کے ہر موڑ پہ دیکھا ہے کہ لوگ
آبرو بیچتے ہیں بھوک مٹانے کے لیے

تو پریشاں نہ ہو اے رسمِ وفا دنیا میں
ہم جو بیٹھے ہیں ترا سوگ منانے کے لیے

اب کے اک جادۂ دشوار پہ چل نکلے ہم
سفرِ زیست کو آسان بنانے کے لیے

لوٹ آئے ہیں تو رہ رہ کے خیال آتا ہے
گھر سے نکلے تو نہ تھے لوٹ کے آنے کے لیے

کتنے پروانے ہوئے شمع پہ قرباں انصرؔ
کتنے افسانے بنے ایک فسانے کے لیے

بنائے عشق دلیلوں پہ کون رکھتا ہے
بجھے چراغ فصیلوں پہ کون رکھتا ہے

یہ کون کھینچتا ہے منزلوں سے دور مجھے
گزوں کے فاصلے میلوں پہ کون رکھتا ہے

نباہتا ہے کہاں کوئی ہم فقیروں سے
قیام ریت کے ٹیلوں پہ کون رکھتا ہے

یہ سوچ کر نہ دیا ہاتھ میں کسی کے ہاتھ
کہ انحصار وسیلوں پہ کون رکھتا ہے

تم نے یہ سلسلہ کبھی دیکھا ہے غور سے
ہر چیز ہے بندھی ہوئی لمحوں کی ڈور سے

اس نے زمیں پہ آئنہ پھینکا تھا زور سے
پھر آنکھ کھل گئی مری دھڑکن کے شور سے

کہنے کو ایک بوند لہو کا سوال تھا
چشمے اُبل پڑے تھے مری پور پور سے

انصرؔ یہ بھید مجھ پہ بڑی دیر میں کھلا
انساں گزر رہا ہے تعصب کے دور سے

ان اجالوں کو اندھیروں کے حوالے کر دو
اپنی آنکھیں مری آنکھوں کے حوالے کر دو

یا اجالو مری گلیاں مرے دیوار و در
یا چراغوں کو ہواؤں کے حوالے کر دو

اپنی سانسوں میں بسا لو مری سانسوں کا سرور
پھر یہ سرگم مرے گیتوں کے حوالے کر دو

میرا خوں میری صداقت کا امیں ٹھہرے گا
یہ وراثت مرے بچوں کے حوالے کر دو

سب سمندر مری آنکھوں کے مقابل رکھو
سب چٹانیں مری راہوں کے حوالے کر دو

سارے ناوک مرے سینے میں اتارو یارو
سارے نشتر مرے زخموں کے حوالے کر دو

تابِ اظہار نہیں ہے تو کسی دن انؔصر
دل کا پیغام اشاروں کے حوالے کر دو

زخم سہلاؤں گا پھر آؤں گا
کچھ سنبھل جاؤں گا پھر آؤں گا

میں تری پیار بھری آنکھوں کا
خواب بن جاؤں گا پھر آؤں گا

وقت جب مجھ کو بھلا بیٹھے گا
خود کو دہراؤں گا پھر آؤں گا

آگ بجھنے میں ذرا دیر ہے دوست
راکھ ہو جاؤں گا پھر آؤں گا

اب تو بہلائے لیے جاتا ہے جی
جی کو بہلاؤں گا پھر آؤں گا

لاکھ کہتے رہو آؤ انصؔر
خوب تڑپاؤں گا پھر آؤں گا

ایک بستی خموش لوگوں کی

شہر کے شور و غل سے کوسوں دور
ایک بستی خموش لوگوں کی
کتنی آباد کتنی ویراں سی
جس کے پودوں سے مجھ کو رغبت ہے
چند تودوں سے مجھ کو رغبت ہے
ہمدمو! یہ وہی جگہ ہے جہاں
ذرّے ذرّے سے پھوٹتا ہے سکوت
سانس لینے سے ٹوٹتا ہے سکوت

دفعتاً یاد آ گئی ہے آج
شہر کے شور و غل سے کوسوں دور
ایک بستی خموش لوگوں کی
میں نے پھر موجۂ ہوا کے ہاتھ
کتنے حسرت بھرے خلوص کے ساتھ
چشمِ نم کا پیام بھیجا ہے
رفتگاں کو سلام بھیجا ہے

پڑا ہے کیسا یہ چکر ہمارے پاؤں میں
قدم ٹھہرتے ہیں اب دھوپ میں نہ چھاؤں میں

دعائے ابر جو مانگی تو یہ گماں بھی نہ تھا
کہ بجلیاں بھی نہاں ہوں گی ان گھٹاؤں میں

اسی سے ترکِ تعلق کی راہ ڈھونڈتے ہیں
لیا تھا مانگ کے ہم نے جسے دعاؤں میں

کبھی تو ٹوٹ ہی جائے گا یہ ہواؤں کا زور
کبھی تو ہم بھی اڑیں گے کھلی فضاؤں میں

میں ایک عمر سے دنیا کی ٹھوکروں میں ہوں
جو ہو سکے تو کمی کر مری سزاؤں میں

فضائے شہر ہے کچھ دن سے دھندلائی ہوئی
فغاں میں ڈوبی ہوئی خون میں نہائی ہوئی

یہ آزمائشِ دل ہے کہ نامرادیٔ شوق!
ابھی ملے بھی نہ تھے ہم کہ پھر جدائی ہوئی

تُو بس یہ دیکھ کہ ترکش میں تیر کتنے ہیں
تُو یہ نہ سوچ کہ کس کی ہے موت آئی ہوئی

نجانے خواب کی تعبیر ہے کہ خواب کوئی
وہ ایک شکل کہ آنکھوں میں ہے سمائی ہوئی

مجھے قبول سبھی تہمتیں مگر انصؔر
یہ فیصلہ بھی تو ہو کس سے بے وفائی ہوئی

پاؤں کی خاک جو چومو گے تو سر کاٹو گے
تم وہ ساحر ہو کہ سائے سے شجر کاٹو گے

ہم تو جس کرب سے گزرے ہیں سو گزرے ہیں دوست
عمر بھر تم بھی اذیت کا سفر کاٹو گے

بے وفاؤں سے وفا مانگنے نکلے ہیں دوست
کوئی پوچھے تو ببولوں سے ثمر کاٹو گے

ہم تو سمجھے تھے کہ تم بھی ہو پرستاروں میں
کیا خبر تھی کہ تمہی دستِ ہنر کاٹو گے

تم جو منزل پہ پہنچ کر بھی کمر بستہ ہو
کیا کسی اور کے حصے کا سفر کاٹو گے

لے کے آئے ہو تنفر کی ہوا گلشن میں
یہی عالم ہے تو شاخوں سے ثمر کاٹو گے

❁

دل کتنا ویراں ویراں تھا شام ڈھلے
تیرے بعد آرام کہاں تھا شام ڈھلے

سناٹے کو کاٹ رہی تھی سانس کی لے
نام کسی کا وردِ زباں تھا شام ڈھلے

سب کا دھیان مری جانب تھا محفل میں
جانے میرا دھیان کہاں تھا شام ڈھلے

اک دریا منزل کی راہ میں حائل تھا
اک دریا آنکھوں سے رواں تھا شام ڈھلے

انصؔر ٹوٹی آس جو اس کے آنے کی!
تارا تارا تیر و سناں تھا شام ڈھلے

کسی کے پاؤں سے لپٹوں نہ خار و خس میں رہوں
میں تیری خاکِ قدم ہوں ترے ہی بس میں رہوں

کہیں اتار کہ اے سیلِ زندگی آخر
کہاں تلک ترِی موجوں کے پیش و پس میں رہوں

ہزار ہاتھ ہیں پھیلے ہوئے مری خاطر
میں کس کے بس میں رہوں کس کی دسترس میں رہوں

جگاؤں خلق کے سوئے ہوئے ضمیروں کو
نوائے درد بنوں نالۂ جرس میں رہوں

ترے بغیر بھی زندہ ہیں کتنے لوگ یہاں
سو کس لیے زرِ دنیا تری ہوس میں رہوں

جن کی آنکھوں کو قیامت کی ادا آتی ہے
ایسے چہروں سے فرشتوں کو حیا آتی ہے

دوست یوں پیار جتانے کے لیے آتے ہیں
جیسے شعلوں سے گلے مل کے ہوا آتی ہے

یہ تماشا بھی پسِ ضبطِ فغاں دیکھا ہے
دل دھڑکتا ہے تو رونے کی صدا آتی ہے

دم بہ دم گھٹتی چلی جاتی ہے انسان کی عمر
جیسے ہر سانس کوئی قرض چکا آتی ہے

اب تو یوں جانیے اس کوئے بتاں میں انؔصر
وہ ولی ہے کہ جسے یادِ خدا آتی ہے

دو شعر

تم نے سوچا ہے کبھی بیٹھ کے تنہائی میں
کتنے دکھ جھیلنے پڑتے ہیں شناسائی میں
ہو کے آباد اُجڑ بھی گئی بستی لیکن
نقش محفوظ رہا چشمِ تماشائی میں

......

دو شعر

گزر گیا ہے خزاں کا عذاب چپکے سے
گلوں پہ آنے لگا ہے شباب چپکے سے
جہاں سے سنگ برستے تھے نفرتوں کے کبھی
وہاں سے آنے لگے ہیں گلاب چپکے سے

ابھی چھوا بھی نہیں تھا مری نگاہوں نے
جکڑ لیا ہے جو لمحہ اجل کی بانہوں نے

یہ کیسی چال چلی مدعی نے راتوں رات
بدل لیے ہیں بیانات ہی گواہوں نے

عجیب حادثہ ہے عدل کی پنہ لے کر
نگر کی رونقیں لوٹی ہیں قتل گاہوں نے

کبھی نمی کے بہانے کبھی نمی کے بغیر
زمینیں بانجھ بنا دی ہیں راجباہوں نے

انہیں سِدھانے کی تدبیر کون سوچے گا
جنہیں درِندہ بنایا ہے درس گاہوں نے

سفر طویل ہے انصرؔ ٹھہر کے دم لے لوں
تھکا دیا ہے بہت الٹی سیدھی راہوں نے

تین شعر

حساب لینے کے ہیں ارادے حیاتِ ناپائیدار دے کر
کیا ہے یزداں نے مجھ پہ احساں یہ چار سانسیں ادھار دے کر

جلا دیئے ہیں گرا کے بجلی یہ برگ و شاخ و گلاب کس نے
لیا گیا ہے حساب کیسا چمن کو فصلِ بہار دے کر

اسی سے مانگو مرادیں اپنی اسی کی چوکھٹ پہ سر جھکاؤ
دلہن بنایا ہے جس نے انؔصر زمیں کو سولہ سنگھار دے کر

کس پہ الزام دھریں شہر کی ویرانی کا
ہم بھی رکھتے تھے بہت شوق بیابانی کا

کتنے عالی ہیں وہ انسان کہ ہر مشکل میں
راستہ ڈھونڈ لیا کرتے ہیں آسانی کا

منتِ لشکرِ اعدا مجھے منظور نہیں
میں تو مر جاؤں مگر نام نہ لوں پانی کا

ہر کوئی ڈوب کے پڑھتا ہے مرے چہرے کو
جیسے حسرت بھرا خط ہو کسی زندانی کا

وحشتِ دربدری کل بھی یہی تھی انصرؔ
پر یہ عالم تو نہ تھا بے سرو سامانی کا

جلوۂ دوست جا بجا ہے آج
خود فریبی کی انتہا ہے آج

وقت کچھ ٹھہر سا گیا ہے آج
جانے کیا حادثہ ہوا ہے آج

جسے دیکھو وہی پریشاں ہے
کچھ عجب شہر کی ہوا ہے آج

وہ جو رکھتا تھا آسماں پہ دماغ
میرے قدموں میں آ پڑا ہے آج

زیست کی کون سی گھڑی ہے یہ
ابتدا ہے کہ انتہا ہے آج

اپنے ہاتھوں جسے تراشا تھا
وہی پتھر خدا بنا ہے آج

کیا کہوں زندگی کے بارے میں
کل جزا تھی مگر سزا ہے آج

کیوں نہ جی بھر کے دیکھ لوں اس کو
مدتوں بعد وہ ملا ہے آج

آج اک اور آس ٹوٹ گئی
اک دیا اور بجھ گیا ہے آج

صبر ممکن نہیں کسی صورت
پانی سر سے گزر گیا ہے آج

سارے چہرے بجھے بجھے سے ہیں
کیا کوئی سانحہ ہوا ہے آج

خوب سے خوب تر یہی ہے دوست
کل جو منزل تھی راستہ ہے آج

کچھ طبیعت بھی شوخ ہے انؔصر
اس پہ چھائی ہوئی گھٹا ہے آج

شام ہوتے ہی خیالوں میں اترنے والے
تیرے دم سے ہیں مرے خواب سنورنے والے

پیار کرنا ہے تو پھر جاں سے گزرنا ہوگا
اس بھنور میں نہ اتر موت سے ڈرنے والے

اتنے سر ڈھانپے تھے میں نے کبھی دستاروں سے
جتنے پاؤں ہیں مرے سر سے گزرنے والے

تم تو کہتے تھے کہ تا عمر نہ بچھڑیں گے ہم
یاد آیا تمہیں وعدے سے مکرنے والے

موت بھی ان کے لیے آبِ بقا ہے اے عشق
زندہ رہتے ہیں تری راہ میں مرنے والے

اس سے آگے کے ٹھکانے مجھے معلوم نہیں
لامکاں تک تو مرے حیطۂ تسخیر میں ہیں

کوئی آنکھوں سے جو دیکھے تو بکھر کر رہ جائے
وہ حوادث کہ ترے پردۂ تقدیر میں ہیں

نائبِ خالقِ کونین ہوں انسان جو ہوں
زہے قسمت مہ و انجم مری جاگیر میں ہیں

عکسِ آئینہ کہاں جوہرِ آئینہ کہاں
وہ مزے خواب میں کب ہیں کہ جو تعبیر میں ہیں

آنکھ حیراں ہے زباں گنگ ہے چہرہ بے نور
یعنی اک عمر سے ہم عالمِ تصویر میں ہیں

دو شعر

ڈر ہے اس دورِ گرانی کے گزرنے کے بعد
جنس بازار میں آئے تو خریدار نہ ہو

تم کسی روز در و بام سے پوچھو تو سہی
گھر سمجھتے ہو جسے وہ کہیں بازار نہ ہو

اپنے تو اپنے غیر بھی بھرتے تھے سسکیاں
لپٹی ہوئی تھیں باپ کی میت سے بیٹیاں

کیا جانے کس مقامِ خرابی پہ جا رکیں
آوارہ گھومتے ہوئے بچوں کی ٹولیاں

آنکھیں بجھیں تو گردشِ دوراں بھی تھم گئی
جلتے ہیں اب چراغ نہ چلتی ہیں آندھیاں

اب کیا کسی کی خوئے کرم آزمائیں ہم
ٹوٹے ہوئے ہیں ہاتھ دریدہ ہیں جھولیاں

نادار گھر کی بیٹیاں اس مخمصے میں ہیں
اب میتیں اٹھیں گی کہ اٹھیں گی ڈولیاں

پھولوں کی پتیاں تھیں کہ نشتر سجے ہوئے
چھونے سے کٹ گئیں مرے ہاتھوں کی انگلیاں

قاتل کو قتل کر دیا اپنے ہی بھائی نے
لو کتنا کام کر گئیں بیوہ کی سسکیاں

سینے میں ثبت کر گیا مہریں جدائی کی
رستے میں نصب کر گیا یادوں کی سولیاں

کانوں میں گونجتی ہے گئے موسموں کی چاپ
جب نیم شب ہواؤں سے بجتی ہیں کھڑکیاں

انؔصر وہ لوگ صاحبِ ایمان ہی نہیں
کرتے ہیں جو گناہ کی نیت سے نیکیاں

کھوکھلے پیڑ کے پہلو میں بھلی لگتی ہے
ایک سوکھی ہوئی ڈالی جو ہری لگتی ہے

ہم محبت میں قناعت پہ یقیں رکھتے ہیں
ہم کو تھوڑی سی عنایت بھی بڑی لگتی ہے

میں بھی اک عام سا انسان ہوں اوروں کی طرح
مجھ میں کیا بات ہے جو تجھ کو بھلی لگتی ہے

بیت جاتے ہیں دبے پاؤں مہ و سالِ حیات
وقت کی چال بھی اک ساحری سی لگتی ہے

کیا عجب کل یہی منزل کا نشاں بن جائے
آج رستے میں جو دیوار کھڑی لگتی ہے

دیر تک چاندنی شب میں کوئی رویا ہوگا
دور تک خاک ستاروں سے بھری لگتی ہے

❁

حالات سے مایوس نہ ہونا اسے کہنا
''امید پہ قائم ہے یہ دنیا اسے کہنا''

کہنا کہ قیامت سی گزرتی ہے شب و روز
اب وقت گزرتا نہیں تنہا اسے کہنا

وعدوں پہ قناعت کی روش چھوڑ چکا ہوں
کھایا ہے کئی بار یہ دھوکا اسے کہنا

جس روز زمانہ ترے دامن کو جھٹک دے
اس روز مرے گھر چلے آنا اسے کہنا

کہنا تو ہمیں بھی ہے اسے حالِ دلِ زار
سنتا ہی نہیں ہے تو بھلا کیا اسے کہنا

موجوں کو کناروں سے ابھرنے کی اجازت
مدت سے کھڑا ہے کوئی پیاسا اسے کہنا

پیڑوں کی پناہوں میں ٹھہرتے ہیں مسافر
سورج کبھی دیتا نہیں سایہ اسے کہنا

اس کے دل پر جو مری یاد کا سایا ہوتا
پوچھنے مجھ سے مرا حال وہ آیا ہوتا

کم نگاہوں سے مراسم نہ بڑھاتے اے کاش!
پاؤں کی دھول کو سر پر نہ بٹھایا ہوتا

اور کچھ روز رفاقت میں گزر سکتے تھے
تم نے خود ہم سے جو دامن نہ چھڑایا ہوتا

آج سیلاب کی موجوں سے نہ الجھے ہوتے
لبِ دریا جو گھروندا نہ بنایا ہوتا

کاٹ لی رات اندھیروں میں تو احساس ہوا
گھر کے آنگن میں کوئی دیپ جلایا ہوتا

مجھ کو سورج کی تمازت نہ جلاتی انؔصر
میرے سر پر جو کسی پیڑ کا سایا ہوتا

دل تو کہتا ہے شب و روز یہی باتیں ہوں
پر یہ ممکن نہیں ہر روز ملاقاتیں ہوں

کیوں مری طرح عذابوں میں کٹیں تیرے دن
کیوں مری طرح گراں تجھ پہ تری راتیں ہوں

دل فسردہ ہی سہی پر یہ ضروری تو نہیں
غم کا عالم بھی وہی ہو وہی برساتیں ہوں

تو نے جو اتنی مروّت سے مجھے سونپے ہیں
وہ تحائف بھی نہ مجھ پر تری خیراتیں ہوں

میں تو وہ ہوں کہ جسے شہر میں تم بانٹ چکے
پھر بھی خواہش ہے کہ پہلی سی مداراتیں ہوں

رائیگاں جائے نہ انؔصر یہ جدائی کا سفر
اس سے بچھڑے ہیں تو خود سے ہی ملاقاتیں ہوں

میرے احساس کی مہکار سمجھنے والا
کوئی تو ہو مری گفتار سمجھنے والا

ایک مدت سے مرے سائے تلے بیٹھا ہے
مجھ کو گرتی ہوئی دیوار سمجھنے والا

اب پشیماں ہے بہت اپنی کم اندیشی پر
میرے اقرار کو انکار سمجھنے والا

آخرش اپنی مروّت کا بھرم کھو بیٹھا
دل کہ ظالم کو بھی غم خوار سمجھنے والا

دل مرا عرصۂ محشر کی خبر چاہتا ہے
ہے کوئی وقت کی رفتار سمجھنے والا

ان نمائش زدہ چہروں میں نہ ڈھونڈو انصر
مدعائے لبِ اظہار سمجھنے والا!

کیا سنائیں تیرے بعد کیسے عمر بیتی ہے
جو بھی سانس آئی ہے دل پہ بار گزری ہے

میری لب کشائی پر کیوں چراغ پا ہیں لوگ
آسماں نہیں ٹوٹا ایک رسم ٹوٹی ہے

سرمئی فضائیں ہیں شبنمی ہوائیں ہیں
کیا کہیں خلاؤں میں کوئی آنکھ روئی ہے

سائے کے تعاقب میں شام تک جلا ہوں میں
جانے کس کے حصے کی دھوپ مجھ پہ برسی ہے

جانے کس ہوا میں ہوں جانے کس فضا میں ہوں
بہہ رہا ہوں پانی میں آگ اوڑھ رکھی ہے

زندگی سے ملنے کو جی اداس ہے انصر
کاش کوئی بتلائے کس گلی میں رہتی ہے

شب سے الجھوں گا اندھیروں کے فنا ہونے تک
آنکھ بجھتی ہے تو بجھ جائے ضیا ہونے تک

پھر کہاں کوئی اسیروں کے قدم روکے گا
درِ زنداں ہے فقط ایک صدا ہونے تک

وہ جو بیگانۂ احساس ہیں کیا سمجھیں گے
ہم پہ کیا بیت گئی نغمہ سرا ہونے تک

یہ کسی دوست کی سازش تھی کہ دشمن کی روش
یہ معمہ ہے فقط وار خطا ہونے تک

ذرّے ذرّے سے مہ و مہر ابھر سکتے ہیں
خاک بے نور ہے ہم رنگِ حنا ہونے تک

اس کو آ جائیں محبت کی ادائیں انؔصر
کاش وہ اپنا تو ہو جائے مرا ہونے تک

بیٹھے بٹھائے مجھ کو پریشان کر گیا
جھونکا کسی کی یاد کا آیا گزر گیا

اک یاد تھی کہ دل سے اترتی چلی گئی
اک زخم تھا کہ وقت کے مرہم سے بھر گیا

راس آ گیا تھا حسنِ تصور مگر یہ دل
خود میں کسی کا عکس جو دیکھا تو ڈر گیا

نکلا غبار دل کا طبیعت سنبھل گئی
برسا جو کھل کے ابر تو موسم نکھر گیا

انصرؔ یہ کیا خلش ہے جو رکھتی ہے بے سکون
دل کی رگوں میں کون یہ کانٹے سے بھر گیا

موجۂ شوق کو رہوارِ ہوا ہونا تھا
تجھ سے ملنا تھا مگر خود سے جدا ہونا تھا

کٹ گئی سانس کی زنجیر تو اچھا ہی ہوا
دامِ ہستی سے بہرحال رہا ہونا تھا

سبز ہاتھوں نے جسے کاٹ گرایا ہے وہ پیڑ
زرد موسم کی عنایت سے ہرا ہونا تھا

لے گیا ہے مرے ہونٹوں سے چرا کر کوئی
ہائے وہ حرف جسے حرفِ دعا ہونا تھا

یار سب چھوڑ گئے وقتِ مصیبت انؔصر
وہی در بند ہوا ہے جسے وا ہونا تھا

اس کی یادوں کے خزانے بھی وہیں چھوڑ آئے
جس کی دہلیز پہ ہم داغِ جبیں چھوڑ آئے

کششِ خاک سے مجبور تھے سو آخر کار
ہم ترے عرش کو اے عرش نشیں چھوڑ آئے

شہر تو چھوڑ ہی آئے مگر اے دشتِ خیال
رونقِ شہر بھی ہم چیں بہ جبیں چھوڑ آئے

عرش کو فرش کی سوغات بھلا کیا دیتے
روح لے آئے بدن زیرِ زمیں چھوڑ آئے

زور و زر کا جنہیں دعویٰ تھا وہی تخت نشیں
زر کہیں زورِ کہیں تخت کہیں چھوڑ آئے

ایسے چھوڑا ہے تری یاد نے دل کا دامن
جیسے جلتا ہوا گھر کوئی مکیں چھوڑ آئے

جاں سے جانے کا ہمیں رنج نہیں ہے انصرؔ
غم فقط یہ ہے کہ یاروں کو غمیں چھوڑ آئے

لے گئی تھی جو ہمیں جانبِ دریا انصرؔ
ہم بھی اس پیاس کو ساحل کے قریں چھوڑ آئے

نغمۂ وطن

قسم اللہ کی ہم کو یہ دھرتی جاں سے پیاری ہے
یہاں کے ذرّے ذرّے کی مہ وانجم سے یاری ہے
اخوت کا علم لے کر نئی راہوں پہ نکلے ہیں
بڑی دھج سے اجالوں کی گزرگاہوں پہ نکلے ہیں
ہماری عمر کا یہ پل کئی صدیوں پہ بھاری ہے
قسم اللہ کی ہم کو یہ دھرتی جاں سے پیاری ہے
مقامِ امتحاں آئے تو جاں پر کھیل جاتے ہیں
ہم اہلِ حق سناں پر بھی کلامِ حق سناتے ہیں
عیاں سارے زمانے پر ہماری جانثاری ہے
قسم اللہ کی ہم کو یہ دھرتی جاں سے پیاری ہے

ہمارے سامنے آنے کی ہمت کون کرتا ہے
یہ جاں کس کو نہیں پیاری خوشی سے کون مرتا ہے
کہ ہم مردانِ آہن ہیں ہمارا وار کاری ہے
قسم اللہ کی ہم کو یہ دھرتی جاں سے پیاری ہے

گماں یقین کے سانچے میں ڈھل نہ جائے کہیں
وہ شخص کوئی نئی چال چل نہ جائے کہیں

مجھے قبول ہے پیمانِ دوستی لیکن
تمہارے شوق کا عالم بدل نہ جائے کہیں

وہ زہر جس کی تمنا میں مر رہے ہیں ہم
وہ زہر پی کے طبیعت سنبھل نہ جائے کہیں

ابھی سے ہاتھ بڑھا دو مصالحت کے لیے
کہ تیرِ وقت کماں سے نکل نہ جائے کہیں

وہ ہاتھ ہاتھ میں ہے اور ڈر رہا ہوں میں
کہ چلتے چلتے قدم ہی پھسل نہ جائے کہیں

کہیں کیا کہ گلشنِ شوق میں وہ بہارِ غم کا اثر نہیں
کوئی داغ زینتِ دل نہیں کوئی زخم زیبِ جگر نہیں

میں چلا تو ایک ہجوم میں تھا گھرا ہوا مجھے یاد ہے
کہاں کون راہ بدل گیا مرے دوست مجھ کو خبر نہیں

مری داستانِ حیات پر تجھے اعتبار نہیں، نہ ہو
یہ سفر ہے برگِ گلاب کا یہ سفر ہوا کا سفر نہیں

کہاں عشق کی وہ فسوں گری کہ کہوں فسانۂ دلبری
مجھے ابتدا کا پتہ ہے بس مجھے انتہا کی خبر نہیں

کوئی آندھیوں کو خبر کرے تو مری طرف بھی نظر کرے
میں چراغِ راہ گزار ہوں میں غبارِ راہگزر نہیں

جب سامنے وہ آئنہ پیکر نہیں ہوتا
پھر دید کے قابل کوئی منظر نہیں ہوتا

آزر کے سبھی بیٹے براہم نہیں ہوتے
ہر یوسفِ کنعان پیمبر نہیں ہوتا

غم حد سے جو گزرا ہے تو احساس ہوا ہے
دل بجھ کے بھی دل رہتا ہے پتھر نہیں ہوتا

ہر شخص کو منہ مانگی مرادیں نہیں ملتیں
ہر شخص مقدر کا سکندر نہیں ہوتا

کیوں آنکھ سے تھمتے نہیں آنسو کسی لمحے
کیوں دل کو کہیں چین میسر نہیں ہوتا

ہر دل میں محبت ہو یہ ممکن نہیں انصؔر
ہر سیپ کی آغوش میں گوہر نہیں ہوتا

رواں ہے قافلۂ عمر سال و ماہ کے ساتھ
کہ جیسے موجۂ صرصر غبارِ راہ کے ساتھ

جو صلح کر کے گیا ہے جہاں پناہ کے ساتھ
پلٹ کے آئے گا اپنی صفِ سپاہ کے ساتھ

ہر ایک زخم بھرا پر نہیں بھرا اے دوست
جو زخم تُو نے دیا برشِ نگاہ کے ساتھ

جنہیں متاعِ فقیری پہ ناز تھا کل تک
انہیں بھی ہو گئی رغبت کلاہ و جاہ کے ساتھ

یہ کیا کہ آج اسی یارِ بے وفا کے نام
سلام بھیج دیا شوقِ بے پناہ کے ساتھ

ہمارے خون سے رنگیں ہے جس کا ہر ذرّہ
وہ قتل گاہ بھی واقع ہے عدل گاہ کے ساتھ

سراغِ قافلۂ رفتگاں تو مل نہ سکا
لپٹ کے رہ گئیں یادیں دلِ تباہ کے ساتھ

بجھا چراغِ تمنا تو دل بھی ٹوٹ گیا
سو مدعی بھی گیا آخری گواہ کے ساتھ

قدم کھنچے چلے جاتے ہیں اس طرف انؔصر
یہ کس نے مجھ کو پکارا ہے اتنی چاہ کے ساتھ

مری بات مانو یہ حیلے بہانے یہیں ختم کر دو
پشیمان لمحوں کے خونیں فسانے یہیں ختم کر دو

تمہیں لوٹ جانے کا حق ہے جہاں چاہے جب چاہے جاؤ
مگر گزری منزل کے جھوٹے ترانے یہیں ختم کر دو

ندامت کے آنسو بہانے سے پہلے ذرا غور کر لو
مرے سر لگے تہمتوں کے نشانے یہیں ختم کر دو

یہ بارود کی بو پشیمانیوں کے سوا کچھ نہ دے گی
خدارا یہ تیر و تبر آزمانے یہیں ختم کر دو

یہ لہروں کے تیور تباہی کے آثار دکھلا رہے ہیں
سمندر کے ساحل پہ خیمے لگائے یہیں ختم کر دو

جاناں جب سے تم اس آنگن آنا جانا بھول گئے
آنکھیں رونا سیکھ گئیں اور لب مسکانا بھول گئے

تجھ سے میل نہیں تھا جب تک دنیا سے مل لیتے تھے
تجھ سے میل ہوا دنیا کا تانا بانا بھول گئے

وہ جو بیتی رت کی میٹھی یادیں بھول گئے تو کیا
ہم بھی تو ان کی باتوں سے جی بہلانا بھول گئے

بیتابی سے پیشانی پر رہ رہ کر رکھتے ہیں ہاتھ
یوں لگتا ہے قبلۂ عالم کچھ فرمانا بھول گئے

انؔصر کیوں اک مدت سے تم سہمے سہمے رہتے ہو
ایسی بھی کیا چوٹ لگی تم ہنسنا ہنسانا بھول گئے

سوئے دیوار و در نہیں دیکھا
گھر میں رہ کر بھی گھر نہیں دیکھا

ہم نے دیکھی ہے دربدر خوشبو
پھول کو دربدر نہیں دیکھا

اے مرا حال پوچھنے والے
کیا چراغِ سحر نہیں دیکھا

ہم جدھر سے گزر گئے اک بار
لوٹ کر پھر اُدھر نہیں دیکھا

میری آنکھوں نے ذرّے ذرّے میں
اس کو دیکھا مگر نہیں دیکھا

جو بھی یاں لب کشا ہوا افسرؔ
اس کے شانوں پہ سر نہیں دیکھا

علاجِ گردشِ ایام سونپ دو مجھ کو
بس ایک مست خنک شام سونپ دو مجھ کو

میں اپنے زخم تمہاری نظر سے دیکھتا ہوں
تنک نگاہی کا الزام سونپ دو مجھ کو

مرے وجود مرے خال و خط پہ رحم کرو
میں اک کھنڈر ہوں کوئی نام سونپ دو مجھ کو

مزہ تو جب ہے برابر کا بوجھ لے کے چلیں
کچھ اپنے حصے کے آلام سونپ دو مجھ کو

مجھے مٹانے کی زحمت جو کر رہے ہو تم
جو ہو سکے تو یہی کام سونپ دو مجھ کو

میری قسمت میں سلگتے ہوئے سائے کیوں ہیں
شہر اپنا ہے تو پھر لوگ پرائے کیوں ہیں

کیا اسی بات پہ تو مجھ سے بگڑ بیٹھا ہے
کہ ترے وعدے تجھے یاد دلائے کیوں ہیں

ہمسفر لوٹ رہے ہیں تو کھڑا سوچتا ہوں
جن کو رستے سے پلٹنا تھا وہ آئے کیوں ہیں

کیا شبِ تار بہاروں کا بھرم کھول گئی
برگ و گل آج پسینے میں نہائے کیوں ہیں

کس کی آمد ہے کہ ہلچل سی مچی ہے انصرؔ
گر نہیں جشن، در و بام سجائے کیوں ہیں

تین شعر

ہم راتوں کو چھپ چھپ روئیں دن کو ہنس ہنس بولیں
لے بیٹھی ہیں تیری یادیں بھید یہ کیسے کھولیں

ہم سے بڑھ کر حال ہمارا پوچھنے والا جانے
ہم کیا حال سنائیں اپنا اور منہ سے کیا بولیں

جیتے جی کب جاں چھوٹے گی دنیا کے جھگڑوں سے
آدھی رات ہوئی ہے انصرؔ آؤ پل بھر سو لیں

کتنی آسانی سے تم بزمِ جہاں چھوڑ چلے
اور سوچا بھی نہیں کس کو کہاں چھوڑ چلے

میں تو جنگاہ میں اترا تھا انہی کی خاطر
دوست جو مجھ کو سرِ نوکِ سناں چھوڑ چلے

یوں تو چپ چاپ چلے عالمِ فانی سے ہم
ایک عالم کو مگر نوحہ کناں چھوڑ چلے

کل جو دنیا نے وراثت میں دیئے تھے ہم کو
ہم بھی ترکے میں وہی تیر و کماں چھوڑ چلے

مات کھائے ہوئے لشکر کی طرح ہم انصر
سرنگوں مہر بلب قریۂ جاں چھوڑ چلے

تمام عمر کا احسان یوں چکانے لگے
سگانِ شہر مری ہڈیاں چبانے لگے

شکستگی کا یہ عالم کہ شام ہی سے ہم
ہوا کے خوف سے گھر کے دیئے بجھانے لگے

جو خود کسی کے سہارے پہ چلتے پھرتے ہیں
وہ کور چشم ہمیں راستہ دکھانے لگے

بدن جھلسنے لگا جب زمیں کی حدت سے
تو یار دھوپ کی سوغات لے کے آنے لگے

بڑے عجیب ہیں انصرؔ یہاں کے مفلس بھی
میسر آئی نہ روٹی تو زہر کھانے لگے

جس نے اس خاک کی توقیر پہ سر وار دیا
ہم نے ہر روز اسے زندہ کیا مار دیا

دینے والے یہی احسان بہت ہے تُو نے
عہدِ غفلت میں مجھے دیدۂ بیدار دیا

جس کی تعظیم سدا قرض رہی ہے مجھ پر
مجھ کو اس شہر کے لوگوں نے بہت پیار دیا

عشق نے جب بھی دیا اپنی صداقت کا ثبوت
یا سرِ دار دیا یا سرِ دربار دیا

جب کبھی دھوپ کی شدت سے بدن جلنے لگا
مجھ کو اک پیڑ کی چھاؤں نے بہت پیار دیا

پھونک دو ایسے شہنشاہوں کے درباروں کو
جہاں خیرات بھی ملتی نہیں ناداروں کو

ہوس آلود محبت کے سہارے کچھ لوگ
گھر کی دہلیز پہ لے آئے خریداروں کو

ترکِ حق گوئی کی ترغیب نہ دے اے دشمن
ہم نہیں بیچتے اسلاف کی دستاروں کو

ہم بھی کیا شے ہیں عقیدت سے بٹھا دیتے ہیں
مسندِ شاہی پہ دشمن کے نمک خواروں کو

تیری خوشبو سے معطر ہو تو اے گل اندام
دمِ عیسیٰ ہے، ہوا بھی ترے بیماروں کو

آخری معرکہ باقی ہے ابھی دشمن سے
ہاں نیاموں میں نہ رکھو ابھی تلواروں کو

دوریاں عشق میں اچھی نہیں ہوتیں انصرؔ
آ، گرا ڈالتے ہیں راہ کی دیواروں کو

لگ گئے خواب ٹھکانے سارے
پا گئے تیر نشانے سارے

آ کسی روز سناؤں تجھ کو
وہ حقائق وہ فسانے سارے

میری آنکھوں میں بسیرا کر لو
بھول جاؤ گے ٹھکانے سارے

چار تنکوں کو بچانے کے لیے
پڑ گئے دیپ بجھانے سارے

اب پرکھنا ہے نئے یاروں کو
آزمائے ہیں پرانے سارے

یہ ہوا، چاند، ستارے انصؔر
آئے ہیں مجھ کو رلانے سارے

مرگِ غیرت کیا کہیں کیسے ہیں ہم
سرد خانوں میں پڑے لاشے ہیں ہم

انتہائے نارسائی دیکھیے
برلبِ دریا ہیں اور پیاسے ہیں ہم

کھینچ لاتی ہے ہمیں گھر کی کشش
لوٹ آتے ہیں جدھر جاتے ہیں ہم

خاکِ گلشن تیری زرخیزی کی خیر
لے تجھے اپنا لہو دیتے ہیں ہم

حوصلہ ہارا ہے منزل کے قریب
ہائے کس جا ٹوٹ کر بکھرے ہیں ہم

ہے عجب رنگِ طبیعت ان دنوں
واں نہیں ہوتے جہاں ہوتے ہیں ہم

کون روکے گا ہمارا راستہ
آندھیاں اوڑھے ہوئے نکلے ہیں ہم

دیکھ لے دنیا سخن کے شہر میں
اک نئے انداز سے آئے ہیں ہم

ان سے یوں ملتے ہیں انصؔر آج کل
جیسے اپنے آپ سے ملتے ہیں ہم

کسی کے پاؤں سے لپٹوں نہ خار و خس میں رہوں
میں تیری خاکِ قدم ہوں ترے ہی بس میں رہوں

کہیں اتار کہ اے سیلِ زندگی آخر
کہاں تلک تری موجوں کے پیش و پس میں رہوں

ہزار ہاتھ ہیں پھیلے ہوئے مری خاطر
میں کس کے بس میں رہوں کس کی دسترس میں رہوں

جگاؤں خلق کے سوئے ہوئے ضمیروں کو
نوائے درد بنوں نالۂ جرس میں رہوں

ترے بغیر بھی زندہ ہیں کتنے لوگ یہاں
سو کس لیے زرِ دنیا تری ہوس میں رہوں